حسن کوزہ گر

ذوالکفل حیدر

'Hasan Koozagar' is a poem written in four parts by Rashed and considered to be one of the finest Urdu poems of the twentieth century. Zulkifil Haider, a senior at LUMS has tried to critically evaluate and understand this complex poem about love, life and the creative process.

'حسن کوزہ گر' راشد کی ایک نہایت ہی اہم نظم اور فکری و فنی اعتبار سے ایک شاہکار ہے۔ 'حسن کوزہ گر' کو راشد کے ہاں وہ مقام حاصل ہے جو 'مسجد قُرطبہ' کو اقبال کی اُردو شاعری میں ہے۔ 'حسن کوزہ گر' چار حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصہ دوسرے حصے سے پیوستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ ایک مکمل نظم بھی ہے۔

اس نظم کے تین بنیادی موضوعات ہیں: عشق، تخلیق اور تخلیقی عمل اور زندگی اپنی پوری سفاکی اور ہمہ گیری کے ساتھ۔ یہ نظم شعری تخلیق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک داستان بھی ہے۔ اس داستان کے پانچ اہم کردار ہیں اور چند ایک ضمنی کردار بھی۔ اہم کرداروں میں حسن کوزہ گر، جہاں زاد، لبیب، سوختہ بخت اور نوجوان حسن شامل ہیں۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جس نے جدید اُردو شاعری کے لئے نئے راستوں کی نشاندہی کی۔

میں اپنی اس گفتگو کو فقط اس نظم کے موضوعات تک محدود رکھوں گا اور ان پر مختصر اُروشنی ڈالوں گا۔ ''تعلق'' راشد کے ہاں ایک نہایت ہی اہم موضوع ہے۔ اس نظم میں تعلق فقط مادی سطح

کا نہیں بلکہ اس کو ایک روحانی جہت بھی حاصل ہے۔ جس نے اس جذبے کو حسن کے لئے عشق میں تبدیل کر دیا ہے۔ نظم کے پہلے اور دوسرے حصے میں اس جذبے کو اس نظم کے کردار ''حسن'' نے اپنی روح کی گہرائی سے محسوس کیا ہے اور اسی جذبے کی شدت نے اس کی شخصیت، اس کی سوچ اور اس کے باطن کو متاثر کیا ہے۔ جہاں زاد کے عشق میں حسن کی تڑپ، بے چینی، اضطراب، وحشت اور خواہشِ حصول جنون کی صورت اختیار کر لیتی ہے:

کسی خستہ جاں رنج بر کُوزہ گر کے لیے
ایک ہی رات وہ گہر بار تھی
کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا وجود ـــــ
اس کی جاں اس کا پیکر
مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا
حسن کُوزہ گر جس میں ڈوبا تو اُبھرا نہیں ہے!

اور اس کے بعد یہ عشق ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتا ہے۔ اب اس عشق میں ایک فاصلہ، بے نیازی، بے یقینی اور بیزاری کا بھی عنصر شامل ہو جاتا ہے اور وارفتگی، بے ترتیبی اور جمود میں کمی آجاتی ہے۔ اس مرحلے پر شاعر محبوب کو ایک حقیقی رخ سے دیکھتا ہے اور فقط عشق کے سحر میں مبتلا نہیں رہتا بلکہ اس عشق کے اپنی زندگی پر اثرات کو بیان کرتا ہے اور اس کا تجزیہ کرتا ہے:

میں جو لوٹا ہوں تو وہ سوختہ بخت
آ کے مجھے دیکھتی ہے
دیر تک دیکھتی رہ جاتی ہے
میرے اس جھونپڑے میں کچھ بھی نہیں ـــــ
کھیل اِک سادہ محبت کا
شب و روز کے اِس بڑھتے ہوئے کھوکھلے پن میں جو کبھی

کھیلتے ہیں
کبھی رو لیتے ہیں مل کر، کبھی گا لیتے ہیں،
اور مل کر کبھی ہنس لیتے ہیں
دل کے جینے کے بہانے کے سوا اور نہیں ـــــ

ایسا کرتے ہوئے وہ تعلق کے مختلف مراحل کو بیان کرتا ہے۔ اس کا جذبہ ایک گہری سوچ اور فکر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ محبوب سے ملنے کی امید ایک دوری کے تعلق میں بدل جاتی ہے اور تعلق کا محض ایک تصور قائم ہوتا ہے۔ مگر یہی تصور پھر ایک حقیقی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس میں اس کے محبوب کی ایک اپنی الگ پہچان، ترجیحات اور اپنی دنیا ہے۔ نظم کے اسی حصے میں لبیب نام کا ایک رقیب بھی شامل ہوتا ہے۔ جس کا وجود حسن کو جہاں زاد سے بدگمان کر دیتا ہے۔ یہاں رقیب کا کردار اُردو شاعری میں ایک نئے طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ حسن کو لبیب سے احساسِ رقابت، حسد یا رشک نہیں ہوتا، بلکہ وہ بھی رقیب کو اپنی طرح جہاں زاد کے آگے بے وقعت تصور کرتا ہے:

نہیں یہ سچ ہے ـــــ میں ہوں یا لبیب ہو
رقیب ہو تو کس لیے تری خود آگہی کی بے ریا نشاطِ ناب کا

حسن، جو پہلے اپنے آپ کو جہاں زاد کے عشق میں فنا کر چکا تھا، اب اس کے اندر ایک انا اور self conciousness جنم لیتی ہے اور وہ اپنے نفس، اپنے وجود اور اس سے جُڑی تخلیق کو محبوب سے مختلف اور اس کے وجود سے مقدم تصور کرتا ہے:

میں سب سے پہلے ''آپ'' ہوں
اگر ہمیں ہوں ـــــ تُو ہو اور مَیں ہوں ـــــ پھر بھی مَیں
ہر ایک شے سے پہلے آپ ہوں!

یہ احساس اس کے اندر محبوب سے فاصلہ، تلخی اور بیزاری پیدا کر دیتا ہے اور یہی بیزاری اور محبوب کی نشاط کی طلب اس کے لئے رقیب کو بھی بے حیثیت اور unthreatening

کر دیتی ہے۔ مگر رقیب جو کہ محبوب کے تصور سے وابستہ ہے، حسن کو ایک تحریک فراہم کرتا ہے وہ تحریک جو تخلیق کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے اور وہ اس مثلثِ قدیم کی الجھن میں قید سا ہو کے رہ جاتا ہے۔ اب محبوب کا وصال اتنا اہم نہیں رہتا اور ایک لامتناہی انتظار اور لاحاصلی کی شکل اختیار کر لیتا ہے:

جہاں زاد،
ایک تُو اور ایک وہ اور ایک مَیں
یہ تین زاویے کسی مثلثِ قدیم کے
ہمیشہ گھومتے رہے
کہ جیسے میرا چاک گھومتا رہا
مگر نہ اپنے آپ کا کوئی سراغ پا سکے ـــــ
مثلثِ قدیم کو مَیں توڑ دوں، جو تُو کہے، مگر نہیں
جو سحر مجھ پہ چاک کا وہی ہے اِس مثلّثِ قدیم کا

اس نظم میں دوسرا اہم موضوع تخلیق اور تخلیقی عمل ہے۔ راشد کے ہاں تخلیق کو عشق پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں شاعر تخلیق کا ذکر کرتا ہے اور تحریک کی موجودگی اور اس کے ابتدائی اثرات پہ بات کرتا ہے۔ ابتدائے تخلیق اور اس میں پیش آنے والے کرب ناک مراحل کو بیان کرتا ہے۔ تخلیق سے دوری اور ذہن و جاں پہ جمود طاری ہونے کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کیفیت کی تکلیف، بے چینی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے یقینی کو بیان کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تخلیق کے جوہر کی وجہ سے حسن کی ذات پر ایک نہ ختم ہونے والی مستقل گھبراہٹ، بے سکونی اور حزن کے اثرات کا ذکر بھی موجود ہے۔ تخلیق کی ضرورت اور اس کی بقاء کے لئے اک خلش کا ہونا ضروری ہے۔ نظم کے آخری حصے میں شاعر اپنی تخلیق کی نشانیوں اور ان کی اہمیت کا اثبات کرتا ہے۔ شاعر خود آگہی کے مقام پہ ہے:

"وہ آنکھیں ہمیں ہیں جو اندر کھلی ہیں"

تمہیں دیکھتی ہیں، ہر اِک درد کو بھانپتی ہیں
ہر اِک حُسن کے راز کو جانتی ہیں

اس کے علاوہ اظہار کے کرب یعنی (دردِ رسالت) پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ آخری حصے میں راشد نے ایک تخلیق کار کی کہانی کو زمان و مکاں کی حدود سے ماورا دیکھا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وقتِ موجود کی طرح ہزاروں برس بعد بھی پرکھنے والے، اس کی تخلیق کے مداح، اس کرب کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے جو تخلیق کا باعث ہے۔ حسن کو بحیثیت خالق اپنی تخلیق کے inspirational ہونے کے باوجود لوگوں کی کم فہمی کا ادراک ہے:

انھیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے ـــــ
انھیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے؟
انھیں کیا خبر کون سے حُسن سے؟
کون سی ذات سے، کس خدوخال سے
مَیں نے گوزوں کے چہرے اُتارے؟

تخلیق کار اپنی تخلیق کے اندر زندہ ہے جو باقی رہنے والی ہے۔ تخلیق کار مر سکتا ہے مگر تخلیقی عمل اور تخلیق کو دوام حاصل ہے۔ عہد بہ عہد ہر تخلیق کار اس دردِ رسالت کے رشتے سے منسلک ہیں:

اور اب اس جگہ وقت کی صُبح ہونے سے پہلے
یہ ہم اور یہ نوجواں گوزہ گر
ایک رویا میں پھر سے پروئے گئے ہیں!

تیسرا اہم موضوع زندگی کی حقیقت ہے۔ زندگی جس میں طلب اور جستجو کے ساتھ ساتھ سفاکی، بے مہری اور تلخی بھی ہے، جذبات، حالات اور ترجیحات کی ناپائداری شامل ہے۔ یہ نظم انسانی زندگی میں مختلف رشتوں، تعلقات ان کی اہمیت، نوعیت اور ان کے بدلتے ہوئے رنگوں کا بیان بھی ہے۔ زندگی اپنے تمام تر واقعات اور ترتیب کے ساتھ بھی فقط ایک حادثات کا سلسلہ

ہے شاعر کو اس میں نشاط کے ساتھ ساتھ بے راہ روی کا شعور بھی ہے۔ عشق اپنی خواب ناک کیفیت، سحر اور رنگین احساسات کے باوجود بھی میدانِ عمل میں زندگی کی سفاک حقیقتوں سے نبرد آزما ہونے میں دشواری اور صبر آزما مراحل سے دوچار ہوتا ہے۔ اس نظم میں زندگی کو ایک silent but active force دکھایا گیا ہے جو اپنی آہستہ روی کے ساتھ ہر چیز، جذبہ، حقیقت اور خواب و خیال کو بدل دیتی ہے انسان کو ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش، اضطراب اور نا آسودگی دے جاتی ہے:

حرف سرحد ہیں، جہاں زاد، معانی سرحد
عشق سرحد ہے، جوانی سرحد
اشک سرحد ہیں، تبسّم کی روانی سرحد
دل کے جینے کے بہانے کے سوا اور نہیں ——

(دردِ محرومی کی،
تنہائی کی سرحد بھی کہیں ہے کہ نہیں؟)

راشد کے ہاں زندگی کی اہمیت تخلیقی عمل سے مربوط ہے اور تخلیق کے بغیر بقاء و فنا بھی محض ایک تصوراتی کھیل ہے۔ اس نظم کی ایک اور قابلِ ذکر بات، راشد کا اندازِ بیاں اور زبان کا تخلیقی استعمال ہے۔ ان کی تراکیب مثلاً مثلثِ قدیم، غمزدہ دیوتا، خوابوں کے سیال کوزے، دستِ چابک کے پتلے وغیرہ، اُردو شاعری کو ایک نیا جہانِ تخلیق فراہم کرتی ہیں۔ راشد کے استعارے اور تراکیب ایک نئی فکری کائنات کا پتہ دیتے ہیں، اور صاف امیجری میں مدد کرتے ہیں۔ ان کے استعاروں سے wanting to say more کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ راشد پہ کی گئی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے ہم چند اور اہم باتوں کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔ راشد کی اس نظم کے دوسرے اور تیسرے حصے میں ابہام زیادہ ہے اور نظم کئی چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے راشد بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں اور اپنی زندگی کے تجربے کو اس نظم میں سمو دینا چاہتے ہوں۔ ان دونوں حصوں میں منطقی تسلسل کم ہے مگر ان حصوں میں خیالات و کیفیات ایک

زیریں اور غیر محسوس لہر سے جُڑے ہوئے ہیں۔

آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ راشد کے ہاں تکمیل کا تصور نہیں ہے۔ راشد کے ذہن و فکر کو اتنی وسعت ہے کہ ان کے خیالات کا سلسلہ کہیں بھی حد بندی کا قائل نہیں ہے۔ نہ ہی ان کی فکر کسی ایک نقطے پہ جامد ہوتی ہے۔ راشد کے ہاں تکمیل کا تصور مادّی تکمیل سے ماورا ہے:

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن
تُو چاہے تو مَیں پھر پلٹ جاؤں اُن اپنے مہجور کوزوں کی جانب
گِل و لا کے سوکھے تغاروں کی جانب

راشد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی یہ وسعت ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے۔ یقیناً ان کی شاعری کا یا ان کے خیالات پہ کسی ایک مخصوص نظریۂ فکر کا اطلاق کرنا ان کی شاعری کے ساتھ نا انصافی کرنا ہے۔ ان کی شاعری آفاقی موضوعات اور عالمگیر جذبات کی حامل ہے۔ شاید اسی لیے حمید نسیم نے کہا ہے کہ راشد عالمی سطح کے شاعر ہیں۔

وضاحت

از یاسمین راشد حسن

میں اس بات کو واضح کرنا چاہتی ہوں کہ میرے والد ن۔م۔ راشد نے کبھی بھی یہ خواہش نہیں کی تھی کہ انکی میت کو آگ کے سپرد کیا جائے۔

جب ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۵ میں میرے والد حرکتِ قلب بند ہو جانے سے فوت ہوئے تو میری سوتیلی والدہ شیلہ نے جو کہ باپ کی جانب سے اطالوی اور والدہ کی طرف سے انگریز ہیں مجھے فون کیا کہ میرے والد کی دل کے دورے سے وفات ہوگئی ہے۔ میں نے فوراً مانٹریال سے لندن روانہ ہونے کی تیاری شروع کردی۔ اسی دوران میرے چچا فخر محمد حاجہ کا لاہور سے فون آیا کہ شیلہ میت کو پاکستان بھیجنے کی تیاری نہیں کر رہی بلکہ لندن ہی میں آگ کے سپرد کر رہی ہے۔ اور میں اور فاروق بھی اسے اس حرکت سے منع کریں۔ جیسے ہی مجھے یہ خبر ملی میں نے پریشانی کی حالت میں شیلہ کو دوبارہ فون کیا کہ ہم سب رشتہ داروں کی یہ رائے ہے کہ انہیں سپردِ آگ نہ کیا جائے۔ ہمارا معاشرہ اس

بات کی اجازت نہیں دے گا۔ شیلہ فوراً بولی کہ راشد کی یہ خواہش تھی اور وہ وہی کرے گی جو انکی خواہش تھی۔ اور یہ کہ چند ماہ پہلے جب شیلہ کے اپنے والد (جو اطالوی تھے) انکی میت سوزی کی گئی تھی تو میرے والد نے شیلہ سے یہ کہا تھا کہ "What a nice, quiet way to go!" اسی لیئے انکی یہ خواہش پوری کرنا چاہتی ہے۔ میں نے فوراً لندن روانہ ہونے کا ارادہ ترک کردیا کیونکہ میں اپنے والد کی میت کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔

چند روز بعد میں نے شیلہ کو فون پر پوچھا کہ کیا انکی کوئی آخری رسومات کی ادائیگی کے بارے میں تحریر کردہ کاغذ ہے تو اس نے بتایا کہ لکھا ہوا تو کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ کہ اس نے انکی خواہش کو پورا کیا ہے۔ اور یہ کہ میرے بھائی شہریار جبکی عمر صرف 27 برس تھی اس نے بھی شیلہ کے ساتھ تعاون اور اتفاق کیا ہے۔ شیلہ کو چاہیے تھا کہ میرے چچا حاجہ کی بات سنتی۔ شہریار کم عمری اور زیادہ وقت امریکہ میں رہائش کی وجہ سے اس بات

کی اہمیت کو پیش جان سکا تھا۔ میں اور شہریار جب آخری بار ابی جان سے نومبر ۱۹۷۲ میں برسلز میں شہری کے گھر پر ملے تو انہوں نے ہم سے ذکر کیا کہ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ اب انکا دل کمزور ہو رہا ہے اور معلوم نہیں اب کتنی دیر اور زندگی ہوگی۔ لیکن انہوں نے میت سوزی کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ انکا آخری خط جو انہوں نے ہم سب بہنوں اور بھائی کو 1975 کے شروع میں لکھا تھا اور ہم سب کے جائیداد میں جو بھی حصے بنتے تھے انکے بارے میں لکھا اور اپنی صحت جو خراب ہو رہی تھی اسکا بھی ذکر کیا۔ مگر اپنی میت کو آگ کے سپرد کرنے کا کوئی ذکر پھر بھی نہیں کیا تھا۔ اور اگر فوت ہونے سے چھ مہینے پہلے جب شیلہ کے والد کی میت سوزی ہوئی تھی اور اگر انہوں نے یہ بات پسند کی تھی تو یہ ہمارے چچا صاحب اور ہم سب سے بھی اسکا ذکر ضرور کرتے۔ کیونکہ انکی شروع سے عادت تھی کہ ہر ایسی بات ہم سب سے کہہ دیتے تھے۔

میرے والد بھی چلے گئے، چچا صاحب بھی چلے گئے اور میرا بھائی بھی اللہ کو پیارا ہو گیا اور میں اس دکھ میں ہوں کہ ہم کیوں اُس وقت شیلہ کو نہ روک سکے۔ اُس نے میرے والد کی عظمت اور دانائی کو نہ سمجھا اور اس نازک وقت میں اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اور اُس نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ اُسکے اس قدم سے میرے والد کی ذات کو، اُنکے مذہبی عقیدے کو، اُنکے سامعین کو اور ان پر تحقیقی کام کو کیا کیا خسارہ پہنچے گا۔

— مارچ 2 2010